ترجمہ نگاری: اہمیت و مسائل

محمد یوسف شعبہ اردو، جامعہ آزاد جموں وکشمیر مظفر آباد
ڈاکٹر محمد مسعود عباسی شعبہ اردو، جامعہ آزاد جموں وکشمیر مظفر آباد
ڈاکٹر محمد گل فراز عباسی ایسوسی ایٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج مری

Abstract

Translation is a process of converting a text into another language. Mostly it is assumed as a merely simple act but it is not a simple & easy act. It is a complicated process which requires and demands most technicalities from the translator. Translation is not a process only but also it's a fun. All the knowledge of world is being transferred through this act from one place to another place, one race to another race, one generation to another generation and one civilization to another civilization. So we can say that translation is forming the global village. This article is an effort to narrate the importance, need for translational studies & Difficulties of translation process.

کسی بھی تحریر، تصنیف اور تالیف کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ ہے۔(۱) ترجمہ جذبات، احساسات اور تجربات کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ہے۔ بظاہر یہ ایک آسان کام نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر تکنیکی گوناگوئی کا ایک سمندر یا وسیع صحرا موجود ہے۔ ترجمہ کی مفصل تعریف؛ جس میں اس کی تکنیکی گوناگوئی بھی آجاتی ہے، حسن الدین احمد یوں کرتے

ہیں:

''ترجمہ مصنف کے قلب و ذہن کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے خیال اور فکر کے ابلاغ اور پھر اپنی زبان میں ترسیلِ خیال یا منتقلی کا ایسا عمل ہے جو اصل کے اندازِ ترسیل، طرزِ بیان، ادائے نگارش اور لب و لہجہ کے زیادہ سے زیادہ قریب رہتے ہوئے کیا جائے تاکہ دوسری زبان میں منتقل ہونے کے باوجود اصل کا اندازِ تخاطب اور طرزِ کلام برقرار رہے۔''(۲)

ترجمہ کاری تاریکیوں کو روشن کر کے گم شدہ کڑیاں کو ملا کر ایک ایسی زنجیر بنانے کا عمل ہے جسے تھام کر صدیوں، سالوں، زبانوں، ثقافتوں اور خطوں کی لمبی مسافت کو پاٹتے ہوئے لمحہ موجود سے لمحہ تخلیق تک کا سفر کیا جاتا ہے یہ سفر صرف لمحہ تخلیق تک نہیں ہوتا بلکہ بلکہ ایک نسل اور ماحول تک ہوتا ہے جہاں صاحبِ متن کے نظامِ خیال و فکر و معنی کو منزل گردانا جاتا ہے۔

ترجمہ کاری تخلیقی کرب سے کم نہیں ہے۔ بظاہر تحریر، تصنیف یا تالیف کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے مگر یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا یہ عمل از سرِ نو تخلیق کے قریب ہے۔ ترجمہ کرنے کے اس عمل کے دوران میں شکست و ریخت کا ایک بھرپور گھن چکر چل رہا ہوتا ہے جس سے بہر حال ترجمہ کار کو گزرنا پڑتا ہے۔

انسان کی ابتدا سے ہی رابطے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے۔ اس رابطے کی خواہش نے ہی زبانوں کو جنم دیا۔ انسان نے صوت اور مصوتے سے پہلے اشارے کنایے سے ابلاغ کا کام لیا۔ پھر ایک وہ منزل آئی جب انسان کو آواز کا طلسم سمجھ آ گیا۔ پھر اُس نے اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کے لیے مخصوص آوازوں کا سہارا لیا اور اپنے اظہاری وسیلوں سے دوسرے انسانوں کے ساتھ رشتہ مضبوط کیا۔ اِس سے ایک معاشرے نے جنم لیا۔ اس معاشرے نے پھر مختلف آبادیوں، خطوں، تہذیبوں اور نسلوں کے ساتھ رشتہ قائم کیا اور پھر ارتقاء کی منزل اسے آج کے اس معاشرے کی صورت میں ہمارے سامنے لے آئی ہے۔ اگر ہم اس سارے فسانے کو دیکھیں تو سماجی اکائی فرد سے لے کر سماجی گروہ تک کے اس سارے سفر میں ربط اور ابلاغ کی وہ کڑی در کڑی کھڑی ہے جس کے طفیل انسان نے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا اور بولنا سیکھا۔ ہم اگر بہ نظرِ غائر دیکھیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشاروں، کنایوں اور حرکات و سکنات سے بولنے تک؛ جو ایک دوسرے پر اپنا موقف ظاہر کرنے کی غرض سے تھا، ترجمہ کاری ہی کا ایک پہلو ہے۔ کیوں کہ خاص موقف کی ترسیل ہی دراصل ترجمہ ہے۔ جب

لسانیات کی تشکیل ہوئی تو اس علم نے اپنی افادیت کی تکمیل کے لیے ترجمہ نگاری کو جنم دیا۔ زبانوں کی ترسیل سے بڑھ کر یہ بات اہم اور ضرورت طلب تھی کہ ایک زبان کا ترجمہ کیا جا سکے تو اُس ضرورت نے علم الترجمہ کو دریافت کیا۔ یہ ایک بحث طلب بات ہے کہ ترجمہ نگاری کا علم یا فن ایک دریافت ہے یا ایجاد لیکن اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ ایک خطے سے دوسرے خطے تک انسان کا رابطہ ترجمہ نگاری کے ذریعے ہی ہوا۔ جہاں پر زبان ترجمانی کا فریضہ ادا کرتی نظر آتی ہے وہاں پر ترجمہ بھی ترجمانی کا کام کرتا ہے۔ ترجمہ دُو زبانوں کے درمیان پُل کا کام کرتا ہے۔ پھر یہ پُل دُو زبانوں کے درمیان نہیں بلکہ یہ پُل دُو تہذیبوں کا ملاپ کراتا ہے۔ دُو علم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ دُو زبانوں کی آوازیں، تشبیہات، استعارات، تراکیب، محاورات اور معنی بھی ایک دوسرے سے آشنا ہوتے ہیں۔ یہ آشنائی اس حد تک آ جاتی ہے کہ ''من تو شدم تو من شدی'' کی شکل سامنے آتی ہے۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ زبانیں ترجمے کے فن کے بعد ایک دوسرے کے سہارے زندہ ہیں تو اس میں کوئی منفی بات نہیں۔ زبانیں ایک دوسرے کے سہارے چلتی ہیں۔

ایک دوسرے کے آسرے زندہ رہتی ہیں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان اور ترجمہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اسی ربط و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کہتے ہیں:

''ترجمے کے ذریعے زبان کئی اعتبار سے پھلتی پھولتی ہے۔ ترجمہ جہاں الفاظ اور زبان کی نشو و نما کے ذریعے انسانی علوم میں اضافے کا باعث بنتا ہے وہیں ذہنی سرحدوں کو بھی کشادگی بخشتا ہے زبان کی سطح پر ترجمہ خیالات و جذبات کی ہر کروٹ کو سمونے کی خاطر نت نئے اسالیب بیان متعارف کرواتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت جہاں نئے الفاظ 'استعاروں کے روپ میں جنم لیتے ہیں وہیں پرانے اور برتے گئے الفاظ کو آکسیجن مہیا ہوتی ہے نئے محاورے اور نئے محاکات کے جنم کے ساتھ نئے علوم و فنون سے آشنائی ہوتی ہے ہمیشہ نئی اصناف ادب کا دور ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہو سکا ہے۔''(۳)

ترجمہ نظامِ ابلاغ کی وہ کڑی ہے جسے اس نظام کا مقصد اور روح کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ابلاغ کے نظام کا پورا دائرہ رمز بندی سے رمز کشائی تک بنیادی طور پر ترجمہ ہی ہے۔ ترجمہ ہر وقت انسان کے اندر بولتا ہے۔ اسی قدرتی خود کار عمل کے ذریعے ہی انسان ہر لفظ، ہر لہجے، ہر اشارے، ہر کنایے حتیٰ کہ ہر خاموشی کی معنوی تفہیم کر سکتا ہے۔ ترجمہ انسان کے اندر کا وہی علم ہے جو اُسے اپنے اندر کسی شے کی معرفت کے بارے میں بتاتا ہے۔ ترجمہ انسان کے اندر بیٹھا ہوا وہ ممتحن ہے جو اسے بتاتا ہے کہ تم کس

شے کو پہچان سکتے ہو اور کس چیز سے ناواقف رہ گئے ہو۔ گویا ترجمہ انسان کے حاصل، لاحاصل اور نا حصل تک کا سفر ہے۔ شاید اسی لیے کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ مترجم بھی مصنف ہی ہوتا ہے اور کہیں پر ترجمے کو اصل متن سے بڑھ کر تصور کرتے ہیں۔ میں لاکھ اِس رائے سے اختلاف رکھتا ہوں گا مگر اِس بات کے کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ ترجمہ تشکیلِ نو ہے۔

Re-creation ہے۔ آج کے دور میں فن ردِّ تشکیل تک پہنچ آیا ہے۔ یہ بھی ترجمہ ہے۔ متن، صاحبِ متن، سطور، بین السطور، لفظ، اور معنی کے برابر اور متوازی پیچھا کرتے اور آگے چلنے والے سایہ تک پہنچنا بھی ترجمہ ہی ہے۔

اس بات کا ادراک بہت کم لوگوں کو ہے کہ ادب میں لسانیات اور ترجمہ کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔ زبانوں کو لسانی سطح سے ہٹ کر تحریری اور ادبی سطح پر ترجمہ کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ لسانیات، ادب اور ترجمہ کا دوستانہ کسی ایک خاص عہد، خاص صنف یا خاص نوعیت تک محدود نہیں بلکہ ان کے آپسی رشتے لامحدود ہیں۔ یہ رشتے ازلی رشتے ہیں۔ جس طرح لفظ اور معنی کے رشتے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اُسی طرح زبانوں کی معنویت کو اجاگر کرنے کے لیے ترجمہ کاری کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عالمی سطح پر اجاگر ہونے والی ہر زبان کی ترقی کا سفر ترجمہ کاری سے ہی شروع ہوتا ہے۔ لسانی، ادبی اور نصابی سطح پر ترجمہ اولین ضرورت ہے۔ علوم و فنون کی ترقی کا سارا دارومدار اسی پر ہے۔ زبانوں کی ترقی کے اصولوں کے مطابق پس ماندہ زبانیں آغاز سے ہی اپنی ترقی کی خاطر ترقی یافتہ زبانوں کی مرہونِ منت اور محتاج رہی ہیں۔ اگر ہم پاکستانی زبانوں کو دیکھیں تو بہت ساری زبانیں جو بول چال سے نکل کر ادب کے مرحلے طے کر کے معیاری زبان کے درجے تک پہنچ گئی ہیں؛ وہ بین الاقوامی زبانوں کے ساتھ رابطے کے انتظار میں ہیں۔ یہ انتظار مترجم کے ملنے کا ہے۔

ہر شخص مترجم نہیں بن سکتا۔ ترجمہ تخلیق سے بڑھ کر مشکل کام ہے۔ خود اپنے خیالات کو زبان کی گرفت میں لے آنا ایک مشکل امر ہے تو دوسری اُس زبان کے اظہاریے کو ترتیب دینا اور مشکل ہو جاتا ہے جس کی فصاحت کا دائرہ بہت وسیع ہو۔ اگر ترجمہ ایک ہی لسانی خاندان کی دو زبانوں کے درمیان ہو تو بہر حال ترجمے کے عمل میں آسانی ہوتی ہے لیکن ترجمے کی مشکل اُس وقت بڑھ جاتی ہے جب دونوں زبانوں کا تعلق ایک لسانی گروہ سے نہ ہو۔ اس مشکل پر قابو پانا اذیت ناک تخلیقی عمل ہے۔ اس کے لیے مترجم کو لفظی ترجمے سے گریز کرنا پڑتا ہے۔ اس مقام پر مترجم کو اپنی دیگر صلاحیتوں کو آزمانا پڑتا ہے۔ اُس کے لیے بہت بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ اسے بیک وقت دونوں

زُبانوں کا وفادار رہنا پڑتا ہے۔ ایک زبان میں اگر لب ولہجہ اُکھڑا ہوا ہو تو مترجم کی وفاداری کا امتحان ہے کہ وہ اسے ترجمہ کرتے وقت وفاداری ہی دکھائے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''صرف روانی و سلاست ہی ترجمے کے بنیادی اجزاء نہیں ہیں۔ آپ خود اندازہ کیجیے کہ سنجیدہ و پیچیدہ تحریر کا ترجمہ صرف رواں اور سلیس کیسے ہو سکتا ہے جب کہ زبان کا مزاج اور جملوں کی ساخت ہماری زبان کے مزاج اور جملوں کی ساخت سے مختلف ہو۔''(۴)

ترجمہ کرنے سے پہلے ہم خیال، مفہوم اور لفظ کے درمیان کا ترسیلی رشتہ دیکھیں تو ہمیں سمجھ آئے گی کہ یہ زبان کا ترجمہ کتنا مشکل کام ہے۔ ہم جو کچھ سوچتے ہیں، اُس کا اظہار کرتے وقت اس کا آدھا بھی نہیں کہہ پاتے۔ جو کہہ پاتے ہیں؛ اُس کا کچھ حصہ سامع یا قاری تفہیم اور تعبیر میں ضائع کر بیٹھتا ہے۔ کہیں پر پیغام رساں اور وصول کنندہ کے تفہیمی دائروں میں اتنا فاصلہ ہوتا ہے کہ پیغام کے معنوی دائرے ہی بدل جاتے ہیں۔ اس مقام پر دیکھیں تو دورانِ ترجمہ وہ مقام بھی آجاتا ہے جہاں ترجمہ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ صرف خیال کی لطافت کی ترجمانی کا ہی نہیں بلکہ کہیں تو افعال اور اسماء کی ترجمانی بھی مصیبت بن جاتی ہے۔ مثلاً عربی ایسی وسیع زبان، جس میں ہر ہر موقعے اور کیفیت کی مناسبت پر ہر چیز کے نام بدلتے رہتے ہیں؛ وہاں اسماء کا ترجمہ ہی ناممکن ہو جاتا ہے۔ عربی میں اونٹ، گھوڑا، شیر، تلوار، عورت وغیرہ کے نام ہر وقت کی مناسبت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس موقعہ پر ایک غیر فصیح زبان میں ترجمہ کرنے والا کیا کر سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ عمومی اور معروف نام کے ساتھ ایک وضاحتی اور تشریحی نوٹ ہی لکھ سکتا ہے۔ اس لیے ترجمہ نگاری کے لیے لفظیات دونوں زبانوں میں ایک جیسے معنی مہیا کرنا مشکل تخلیقی جہت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکمل ترجمہ کی صورت بن نہیں پاتی۔ پروفیسر جیلانی کامران ''اردو زبان میں ترجمے کے مسائل'' کے حوالے سے لکھتے ہیں::

''کوئی ترجمہ سو فیصد اصل متن کے مطابق نہیں ہوتا اور دوسری بات یہ نظر آتی ہے کہ خواہ گفتگو ہی کے جملوں کو دو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے جہاں زبانیں ایک ہی لسانی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں وہاں جملے کی ساخت قریباً یکساں ہو گی لیکن جہاں ایسے لسانی گھرانے موجود نہیں وہاں جملے کی ساخت میں ردوبدل کرنا ضروری ہوتا ہے ان دونوں باتوں کو ترجمے کے عمل کی بنیادی دشواری قرار دیا جا سکتا ہے۔''(۵)

اسی بات کو نصیر احمد خان یوں واضح کرتے ہیں:

''ترجمے میں الفاظ کا صحیح استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ایسا کرنے میں ہم ناکام رہے ہیں تو مرکزی خیال، مجموعی تاثر اور خیال کی شدت تینوں چیزیں متاثر ہو سکتی ہیں۔ اس لیے اس منزل سے گزرتے وقت بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ہر لفظ معنی کے اعتبار سے اپنا ایک حلقہ رکھتا ہے اس لیے یہ حلقے اصل کے جتنے مطابق ہوں گے؛ ترجمے کے لیے سود مند ہو گا۔''(۶)

ترجمہ اس وقت اور دشوار ہو جاتا ہے جب ایک جملے کے ایک سے زیادہ معنی اور تشریحات ہو سکتی ہوں۔ ترجمے کی مشکلات کو اس خاص تناظر میں دیکھیں تو اصطلاحات کا مسئلہ ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ اصطلاحات کی بہت سی تعداد ایسی ہے جو بظاہر ایک سی نظر آتی ہے مگر ہر تہذیب، معاشرے اور زبان میں الگ تھلگ معانی رکھتی ہے۔ ان اصطلاحات اور تراکیب کے معنی ہر زبان کے تہذیبی پس منظر میں واضح ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ 'انصاف' اسلامی اور مغربی تہذیب میں مختلف جہتیں رکھتا ہے۔ اسلامی تہذیب میں قاتل کی سزا معاف ہو سکتی ہے اگر مقتول کے ورثاء بخش دیں لیکن مغربی تصورِ عدل میں اس کا کوئی تصور نہیں۔ وہاں پر قاتل کو ہر صورت سزا دی جائے گی۔ اس طرح اسلامی تہذیب کی حامل زبانوں میں انصاف کا مطلب (بعد از معافی ورثائے مقتول) ایک مجرم کو رہا کر دینا ہو سکتا ہے۔ جب کہ مغربی تہذیب کا پس منظر رکھنے والی زبان میں انصاف کا مطلب مجرم کو موت یا عمر قید کی سزا کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسی طرح اسلامی اثرات والی زبانوں میں جیون ساتھی چننے کی آزادی کا مطلب ہو گا کہ ہر بالغ فرد کو اپنی پسند کے مسلمان لڑکے یا لڑکی سے شادی کرنے کی آزادی۔ لیکن یورپ کی تہذیبی پچھوکڑ والی زبان میں اس کا مطلب ہو گا؛ ہر فرد کو اپنی جنسِ مخالف سے شادی کرنے کی اجازت کے ساتھ ساتھ اپنی ہم جنس کے ساتھ شادی کرنے کی بھی قانونی آزادی۔ اسی طرح ''عدت'' محض یک لفظ ہے مگر اس کے ساتھ جُڑے لفظوں کا ادراک بھی ضروری ہے: نطفہ، نکاح، طلاق، نان نفقہ وغیرہ۔ مترجم کی مشکل اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب اسے کہا جاتا ہے کہ اس میں ترجمہ پن محسوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس پر شمس الرحمان فاروقی کا قول صادق آتا ہے:

''کامیاب ترجمہ وہ ہے جو اصل کے مطابق ہو (یا بڑی حد تک اصل کے مطابق ہو) اور خلاقانہ شان رکھتا ہو۔ ظاہر ہے ان دونوں باتوں کا یکجا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔۔۔ لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ ترجمہ کیے ہوئے فن پارے کو ترجمہ نہیں معلوم ہونا چاہیے۔''(۷)

عربی یا یورپی زبان کے ادب پاروں کو ترجمہ کرتے وقت ایک بڑی مشکل جملوں کی طوالت اور ساخت کی بھی ہوتی ہے۔ ہر صاحبِ متن اپنے لاشعوری اظہار میں جملوں کی ساخت کو معنی کی ترسیل کی بجائے مفہوم کے ابلاغ پر نظر رکھتا ہے جو ترجمے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ مترجم کو خود اپنی ذات سے الگ ہونا پڑتا ہے اور جملوں کو توڑ کر نئی دنیا تخلیق کرنا پڑتی ہے۔ اس مشکل کو سمجھنے کے لیے شاہد حمید کا اقتباس دیکھتے ہیں جو انھوں نے 'وار اینڈ پیس'

کے ترجمے کے بعد پیش کیا ہے:

"اردو دراصل چھوٹے چھوٹے جملوں کی زبان ہے اور بڑے جملوں کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔ جملہ طویل ہو جائے تو اس کی سانس اُکھڑنے لگتی ہے۔ انگریزی میں طویل جملے ہوتے ہیں۔ طویل جملے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا قاری کے ذہن میں جو تصویر بٹھانا چاہتا ہے اس کو وہ ٹکڑوں کی بجائے سالم کا سالم پیش کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اردو میں جب آپ ترجمہ کرتے ہیں تو طویل جملوں کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں منقسم کرنا پڑتا ہے۔ جس سے تحریر کا مجموعی اثر غائب ہو جاتا ہے کہ منطقی تسلسل بھی قائم نہیں رہتا۔" (۸)

ہم اپنی اس ساری گفتگو کا حاصل دیکھیں تو ترجمہ نگاری کی مشکلات اور مسائل کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ حقیقت واضح طور پر نظر آتی ہے کہ ہماری علمی، ادبی، ثقافتی اور ہر قسم کی ترقی کا دار و مدار ترجمے کے ساتھ جڑا ہے۔ یوں ترجمہ ایک سیاسی کارروائی ہے، ثقافتی مکالمہ ہے ۔ یہ ثقافتی مکالمہ تہذیبوں کے درمیان ہے۔ یہ مکالمہ نسلوں کے درمیان ہے۔ یہ مکالمہ صدیوں کے درمیان ہے۔ یہ مکالمہ کل اور آج کے بندے کے درمیان ہے۔ یہ مکالمہ آج اور کل آنے والے فرد کے درمیان ہے۔ یہ مکالمہ آوازوں کے درمیان بھی ہے۔ یہ مکالمہ سوئے ہوئے اور جاگتے لفظوں کے درمیان بھی بنتا ہے، یہ مکالمہ لفظوں کے اُن جواہر کے درمیان بھی بنتا ہے جن کے معانی کا تعین نہیں ہو سکا، یہ مکالمہ تو وہاں بھی بنتا ہے جہاں لفظ اور معنی آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور وہاں بھی بنتا ہے جہاں لفظ اور معنی خاموش ہو جاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، مغرب سے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸، ص ۵۰۔

۲۔ حسن الدین احمد، "فنِ ترجمہ" مشمولہ فنِ ترجمہ کاری، مرتبہ: صفدر رشید، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵، ص ۴۷

۳۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، مغرب سے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸، ص ۶۱۔

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، "ترجمہ کے مسائل"، مشمولہ مضمون کا فن اور روایت، مرتبہ: ڈاکٹر رئیس، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ، ۲۰۰۴، ص ۶۳

۵۔ جیلانی کامران، ڈاکٹر، "شعری ادب کے تراجم کے مسائل اور مشکلات"، مشمولہ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل (مرتبہ) اعجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۶۳۲

۶۔ نصیر احمد خان، "ترجمہ اور لسانیات"، مشمولہ فنِ ترجمہ کاری، مرتبہ: صفدر رشید، پورب

اکادمی،اسلام آباد،ء۲۰۱۵،ص۱۷۱۔

۷۔ شمس الرحمان فاروقی،دریافت اور بازیافت: ترجمے کا معاملہ،اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴،
ص۱۴۱:۲۴۱۔

۸۔شاہد حمید،ڈاکٹر، فن و شخصیت،انٹرویو،روزنامہ ایکسپریس لاہور،۲۰۰۸،